Date of Publication: 09-07-2013 PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 10-11 July 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

15-21 July 2013 | ۱۵تا۲۱/جولائی ۲۰۱۳ء
Issue: 27, Vol.: 72 | شمارہ نمبر: ۲۷، جلد نمبر: ۷۲

مدھیہ پردیش میں آزادی کے بعد اردو صحافت

سیفی سرونجی (سیفی لائبریری، سرونج، ضلع ودیشہ، مدھیہ پردیش)

یہ سچ ہے کہ دیگر صوبوں کے مقابلے میں مدھیہ پردیش بہت پیچھے ہے، جس کی تفصیل میں ہمیں نہیں جانا لیکن پچھلے بیس پچیس برسوں میں مدھیہ پردیش میں اردو زبان و ادب اور صحافت میں بہت کام ہوا ہے اور ہنوز ہو رہا ہے بلکہ ان جگہوں پر زیادہ کام ہوا ہے جو کبھی اردو کے علاقے نہیں رہے مثلاً اندور، گوالیار، جھانسی، رتلام، برہانپور، کھنڈوہ وغیرہ؛ جب کہ مدھیہ پردیش میں اردو ادب کے مرکز کہلانے والے شہروں میں بھوپال اور سرونج کو خاص اولیت حاصل رہی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسلم اسٹیٹ رہی، جہاں کے حکمراں نہ صرف ادبی ذوق رکھتے تھے بلکہ ان میں کئی تو خود اچھے شاعر و ادیب رہے ہیں، لیکن ہر مسلم اسٹیٹ میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا سوائے ایک حیدرآباد کے، جہاں سے آج بھی کئی اخبار و رسائل پابندی سے شائع ہو رہے ہیں لیکن باقی تمام مسلم اسٹیٹ میں اردو زبان و ادب کے سلسلے میں کوئی خاص تعمیری کام نہیں ہو رہے ہیں۔ مدھیہ پردیش میں بھی یہی حال ہے، یہاں شاعر تو بے شمار جا بجا ہیں کے لیکن اردو صحافت دم توڑتی نظر آرہی ہے۔ مدھیہ پردیش میں صحافت کا آغاز یوں تو ۱۸۴۰ء کے قریب گوالیار میں گجراتی لال اور لکشمی پرشاد کی ادارت میں شائع ہونے والے 'اخبار گوالیار' سے ہوا۔ مدھیہ پردیش میں دوسرا اخبار اندور سے 'مالوہ اخبار' کے نام سے نکلا جس کے اڈیٹر پنڈت پریم نرائن اور دھرم نرائن تھے۔ ہمارے موضوع کا تعلق چوں کہ آزادی کے بعد مدھیہ پردیش میں اردو صحافت سے ہے، اس لیے ہمیں اس سلسلے میں دور تک نہیں جانا، ہاں یہ ضرور ہے کہ مدھیہ پردیش میں ۱۸۴۰ء سے لے کر آج تک یعنی ایک سو ساٹھ سال میں تقریباً تین ہزار کے قریب اخبار اور رسالے شائع ہوئے ہیں اور بھوپال اردو صحافت کا سب سے بڑا مرکز رہا ہے، حالاں کہ وقتاً فوقتاً جبل پور، اندور، گوالیار، کھنڈوہ، سیہور، برہانپور وغیرہ سے بھی اخبار نکلتے اور بند ہوتے رہے ہیں۔

مدھیہ پردیش میں اردو صحافت پر سب سے زیادہ کام پروفیسر محمد نعمان خاں، عارف عزیز صاحب اور اشتیاق عارف صاحب نے کیا ہے۔ ۱۹۸۹ء میں اشتیاق عارف، قمر جمالی اور شوکت صاحب نے ایک کتاب شائع کی تھی 'مدھیہ پردیش میں اردو صحافت' کے نام سے جس میں مدھیہ پردیش میں اردو صحافت کے آغاز سے لے کر ۱۹۸۹ء تک شائع ہونے والے تمام اہم اخبارات اور رسائل کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا تھا، اس کے علاوہ نعمان صاحب نے بھی مدھیہ پردیش میں صحافت سے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صحافت ہو یا اردو ادب سے متعلق سرگرمیاں ہوں بھوپال ہمیشہ اردو ادب کا مرکز رہا ہے، جتنے بھی اخبار نکلے ہیں یا جنگ آزادی میں حصہ لینے والے رہے ہوں، زیادہ تر کا تعلق بھوپال سے رہا ہے۔ برکت اللہ خاں بھوپالی ہوں یا شاکر علی خاں ہوں یا صحافی ہوں، قومی رہنما ہوں، بھوپال ہی اس کا مرکز رہا ہے۔ کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔ نیاز فتحپوری نے اپنے رسالے کی ابتدا یہیں سے کی، یہ بات بھی سب جانتے ہیں کہ ہندستان کی جنگ آزادی میں سب سے زیادہ اور بڑا رول مسلمانوں کا رہا ہے، کچھ اس لیے ان میں جوش زیادہ تھا کہ حکومت ان کے ہاتھوں سے ہی گئی تھی، بے شمار علما پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔ ظاہر ہے کہ سب سے بڑا ہتھیار اخبار ہوتا ہے، اس لیے زیادہ تر جنگ آزادی میں اردو صحافت نے ہی کام کیا ہے۔ تمام بڑے مجاہد آزادی صحافت سے ہی منسلک رہے۔ ابوالکلام آزاد ہوں یا برکت اللہ بھوپالی ہوں کہ پنڈت جواہر لال نہرو ہوں اردو صحافت کا وہ سنہرا دور تھا، آزادی کے بعد بھی ایسا نہیں کہ اردو صحافت ختم ہوگئی ہو لیکن ملک کی آزادی اور پھر ملک کی تقسیم کے بعد اردو کے ساتھ ایسی ناانصافی ہوئی کہ صحافت تو دور کی بات ہے، زبان کو ہی بچانا مشکل ہوگیا، پھر بھی اس قدر ناانصافی کے باوجود اردو زبان، اردو صحافت زندہ رہی اور آزادی کے بعد اب پھر سے اردو صحافت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ شباب پر آگئی۔ اشتیاق عارف لکھتے ہیں:

> "اردو صحافت کے ساتھ ایک عجیب اتفاق جڑا ہے اور جس پر کوئی بھی صحافت فخر کر سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ جد و جہد سے مدھیہ پردیش کی اردو صحافت کا بہت گہرا رشتہ رہا ہے، جتنے بھی عوامی آندولن ریاست بھوپال میں ہوئے ہیں کوئی نہ کوئی اخبار ان کی آواز بن کر سامنے آیا، یہی وجہ رہی کہ جیل، ضبطی، جرمانہ، مقدمہ اور جلاوطنی جیسے واقعات کا اخباروں اور اخبار نویسوں کو ہمیشہ ہی سامنا کرنا پڑا۔ اگر یہ کہا جائے کہ بھوپال کے عوام کو حکومت کی غلط کاریوں کی مخالفت کرنا اردو صحافت نے ہی سکھایا تو یہ غلط نہ ہوگا۔ مدھیہ پردیش کی صحافت کو جد و جہد کا یہ سبق 'صداقت' ۱۸۸۳ء کے اڈیٹر عبدالکریم اوج نے پڑھایا جس کی پاداش میں انھیں ریاست بھوپال سے جلاوطن ہونا پڑا، اس کے علاوہ بھوپال کے نامور اردو صحافیوں میں کچھ ایسی شخصیتیں بھی ہیں، جنھوں نے پاکستان اور دیگر ممالک میں جاکر، وہاں کی صحافت میں اونچا مقام حاصل کیا۔ قدوس صہبائی 'پاکستان پریس ایسوسی ایشن'، ابوسعید بزمی 'شہباز'، احمد علی خاں 'ڈان'، ایس ایم کامل 'امروز'، شاہد کمال پاشا 'ٹریبون' اور عرفان پرویز 'تہران' کا شمار اسی صف میں کیا جاتا ہے۔"

آزادی کے کچھ دن بعد اردو صحافت ہی نہیں اردو زبان پر بھی قیامت ٹوٹ پڑی لیکن رفتہ رفتہ پھر حالات ٹھیک ہوتے گئے اور اردو صحافت اپنی پرانی روش پر لوٹ آئی، حالاں کہ ملک کی تقسیم نے مسلمانوں کی جان و مال کو زبردست نقصان پہنچایا، جو سرمایہ دار تھے انھوں نے اردو صحافت کو اہمیت نہیں دی، جو اردو صحافی تھے ان کے پاس سرمایہ نہ تھا، پھر بھی وقتاً فوقتاً اخبارات اور رسائل نکلتے رہے۔ مدھیہ پردیش میں یوں تو برہانپور، جبل پور، اندور، گوالیار وغیرہ سے بھی اخبار و رسائل نکلتے رہے لیکن زیادہ عمر نہ پاسکے۔ بھوپال کو جو مرکزیت شروع سے حاصل تھی وہ ہمیشہ قائم رہی۔ آزادی کے بعد بھوپال سے 'افکار'، روزنامہ 'اردو ایکشن'، 'ندیم'، 'آفتاب جدید' برسوں نکلتے رہے، 'ندیم' تو اب بھی برابر جاری ہے، 'اردو ایکشن' حافظ ماجد حسین نکالتے ہیں، پندرہ روزہ 'صدائے اردو' نعیم کوثر نکالتے ہیں۔ پچھلے بارہ سال سے جاوید یزدانی اور کوثر صدیقی

'کاروانِ ادب' نکال رہے ہیں، جس کے کئی خاص نمبر بے حد مقبول ہوئے، خاص طور پر گوپی چند نارنگ نمبر، شمس الرحمٰن فاروقی نمبر اور افسانہ نمبر وغیرہ۔ پچھلے چالیس پچاس برسوں میں بھوپال سے ماہنامہ 'تعمیر' ۱۹۴۷ء میں بھوپال سے نکلنا شروع ہوا، جس کے اڈیٹر حامد صدیقی تھے، ۱۹۴۷ء میں بھوپال سے ہفت وار 'مشق' جس کے اڈیٹر عبدالاحد خاں تھے، ۱۹۴۷ء میں ہی 'جادہ'، ماہنامہ 'منزل'، 'نقاد'، 'ریاست'، 'مستقل'، 'افشاں'، 'پرچم'، 'تشکیل'، 'نوائے وطن'، 'کاشتکار'، 'کلیم'، 'مزدور'، 'معلومات'، 'راہی'، 'اجالا'، 'ہمارا بھوپال'، 'درپیش'، 'آدمی'، 'نیا دور'، 'مہاجر'، 'پکار'، 'ترجمان'، 'حقیقت'، 'نیا بھوپال'، 'روزگار'، 'کردار'، 'چمن'، 'خورشید'، 'اقدام' اور 'آوازِ الحمرا' جیسے سینکڑوں چھوٹے بڑے روزنامے، ہفت روزہ، ماہنامے اور سہ ماہی نکلتے اور بند ہوتے رہے، اس کے علاوہ مدھیہ پردیش میں کھنڈوہ سے ماہنامہ 'نئے پرانے چراغ' نے اردو صحافت کے فروغ میں اہم رول ادا کیا، جس کے اڈیٹر مشہور شاعر و ادیب مظفر حنفی تھے۔ سیہور سے 'سیہور سماچار' نکلتا رہا، لیکن بھوپال سے تو درجنوں اخبار اور رسائل نکلتے رہے، بند بھی ہوتے رہے، ان میں خاص طور پر ماہنامہ 'کائنات'، ہفت روزہ 'رفتار'، ماہنامہ 'جگنو' جس کے اڈیٹر نعیم کوثر تھے۔ سیفیہ کالج کے مجلوں کی الگ تاریخ ہے۔ 'تشکیل'، 'زنجیر'، 'آوزہ'، 'مزاج' جیسے فضل تابش جیسے باصلاحیت شاعر و ادیب نکالتے تھے۔ برہانپور سے ماہنامہ 'شجر' بھی نکلا۔ شیوپوری سے 'ادراک'، جبلپور سے ہفت روزہ 'ہمارا اخبار'، اندور سے 'دستک' اور 'شاخیں'، ہفت روزہ 'دشوار' نکلے اور جلد ہی بند ہوگئے۔ گوالیار سے قمر برتر 'فنکار' نکالتے ہیں، جو اب بھی جاری ہے۔ ۱۹۷۹ء میں بھوپال سے ظفر صہبائی اور اقبال مسعود کی ادارت میں 'شناخت' جاری ہوا، لیکن دو شماروں کے بعد بند ہوگیا۔ جب کہ 'شناخت' کے پہلے شمارے نے ہی اپنی شناخت قائم کرلی تھی۔ اسی طرح اجین سے شائع ہونے والے رسالوں میں 'آفتاب مالوہ' اور 'مشعل و شبنم' کا نام لیا جاسکتا ہے۔ یہ رسائل دو تین سال نکلنے کے بعد بند ہوگئے، اسی طرح گوالیار سے پہلا ادبی رسالہ 'تان سین' جو پروفیسر نرائن پرشاد ورما مہر جانشین داغ دہلوی کے زیر ادارت شائع ہوا۔ بھوپال میں اردو صحافت کے سلسلے میں مشہور صحافی عارف عزیز لکھتے ہیں:

''بھوپال کی اردو صحافت میں جس اخبار کی سب سے زیادہ پذیرائی ہوئی اور عوام و خواص میں اسے مقبولیت ملی، وہ بھاسکر گروپ کا اردو روزنامہ 'آفتاب جدید' ہے جو تجربہ کار صحافی اشتیاق عارف کی ادارت میں ۱۹۷۸ء میں طلوع ہوا اور ۱۹۸۶ء تک بڑی شان سے نکلتا رہا۔ مالکان سے اختلاف پیدا ہونے پر کوئی چھ سال بعد اشتیاق عارف مستعفی ہوگئے تو سید محمود الحسن نے اس کی ادارت سنبھال لی۔ ایک ماہ بعد ان کے اچانک سانحۂ ارتحال پر بظاہر اڈیٹرشپ کا قرعۂ فال غضنفر علی خاں کے نام نکلا لیکن عملاً یہ ذمہ داری تین سال تک مفتی جنید صدیقی اور کچھ عرصہ مقصود عمرانی انجام دیتے رہے، آخر میں اردو کے پرانے صحافی اوپناش چندر رائے جو دہلی کے آریہ سماجی اردو اخبارات 'تیج' اور 'ملاپ' میں کام کا تجربہ رکھتے تھے، اخبار کی پالیسی کو کنٹرول کرنے کے لیے اڈمنسٹریٹر بنائے گئے لیکن ناکام رہے۔ تو اس اخبار کو اپنے عین عروج کے زمانے میں آٹھ سال تک شائع ہونے کے بعد ۱۹۸۶ء میں اس لیے بند کردیا گیا کہ مالکان اور ادارتی عملہ کے مابین بابری مسجد اور پرسنل لا کے موضوعات پر اختلاف رائے پیدا ہوگیا''۔

اس طرح بھوپال میں 'آفتاب جدید' کے بعد 'بھوپال ٹائمز'، 'افکار' اور 'اردو ایکشن' کا شمار مقبول اخبارات میں کیا جاتا ہے۔ اب 'اردو ایکشن' کے علاوہ یہ اخبارات بند ہوچکے ہیں، ہاں نعیم کوثر کا پندرہ روزہ اخبار 'صدائے اردو' ضرور جاری ہے جو اب پندرہ دن کے بجائے ایک ماہ میں آنے لگا ہے، کچھ دنوں سے 'بھوپال ہلچل' کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار جاوید یزدانی نے نکالنا شروع کیا ہے۔ گوالیار، اجین، جبل پور، اندور، رتلام، برہانپور، کھنڈوہ، سیہور کے علاوہ مدھیہ پردیش میں بھوپال سے سو کلومیٹر کے قریب سرونج ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو کبھی ریاست ٹونک کا حصہ رہا ہے، جہاں بھوپال کے بعد سب سے زیادہ علم و ادب کا ماحول رہا ہے۔ سرونج سے اسکول میگزین کے علاوہ چند قلمی پرچے تعمیر، راہی، حصار وغیرہ ضرور نکلے لیکن پریس سے شائع ہونے والا پرچہ سہ ماہی 'انتساب' ہے جو جون ۱۹۸۳ء سے شروع ہوا اور آج تک برابر جاری ہے۔ 'انتساب' نے مدھیہ پردیش میں ایک ریکارڈ قائم کیا۔ پورے مدھیہ پردیش میں ۳۲ سال تک جاری رہنے کا اعزاز 'انتساب' کو حاصل ہے۔ یہی نہیں، 'انتساب' کے کم از کم دو درجن خصوصی نمبر بھی ادبی دنیا میں ایک مقام رکھتے ہیں، جن میں کچھ تو پانچ پانچ سو صفحات سے زیادہ کے نمبر ہیں۔ بشیر بدر نمبر، خالد محمود نمبر، ظفر گورکھپوری نمبر، ندا فاضلی نمبر، قاضی مشتاق احمد نمبر، پروین شیر، محمد ایوب واقف، صوفیہ انجم تاج، وقار قاطمی، حافظ کرناٹکی، پروفیسر آفاق احمد، مختار شمیم، شاہد میر نمبر کے علاوہ اور بھی کئی خصوصی شمارے شائع کیے۔ 'انتساب' آج ساری ادبی دنیا میں جانا جاتا ہے اور خاص طور سے بیرونی ممالک میں بے حد مقبول ہے۔ انتساب پبلی کیشنز کے زیر اہتمام سو سے زیادہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ 'انتساب' کی اشاعت کو ۳۱ سال سے زیادہ ہوچکے ہیں، آج سرونج 'انتساب' کی وجہ سے ساری ادبی دنیا میں جانا جاتا ہے۔

پروفیسر محمد نعمان خاں لکھتے ہیں:

''۱۹۶۷ء میں برہانپور سے ایک معیاری ماہنامہ 'شجر' زیر نگرانی حاجی محمد صلاح الدین قریشی شائع ہوا تھا، جس کے چیف اڈیٹر اندر سین اور معاون مدیر اقبال نصیب تھے، معلوم نہیں یہ رسالہ کتنے عرصے تک جاری رہ سکا۔ حاجی باب اللہ خاں کی زیر ادارت ۱۹۷۴ء میں شیوپوری سے ایک ادبی ماہنامہ 'ادراک' منی ایچر اسٹائل فارم پر جاری ہوا۔ یہ رسالہ جدید ادب کا ترجمان تھا، جس میں ملک کے نامور جدید شعرا و ادبا کی

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

ماضی کے جھروکے سے

تیسری اور آخری قسط

پرانے ہندستان کا ایک شاعر: امارو

عورت اور عورت

(۱)

ابھی تھوڑی دیر ہوئی کہ وہ مجھے سدا کے لیے چھوڑ گیا۔ لیکن میں ہمت سے کام لوں گی اور کوئی بھی میری ناامیدی کو دیکھ نہ پائے گا
میں مسکراتی ہوں، میں تو مسکرا رہی ہوں!
تمھاری مسکراہٹ میں ویسی ہی اداسی ہے جیسی اس صبح میں جو کسی آتش زدہ گاؤں پر نمودار ہوئی ہو

(۲)

یہ لڑکیاں کپڑے دھوتے ہوئے اپنی چنچل باتوں سے اتنا شور مچاتی ہیں کہ جو تم کہہ رہی تھیں وہ میں سُن ہی نہ سکی
اس نے میری گردن کو اپنے بازوؤں کی لپیٹ میں لے لیا، اپنی سانس میری سانس میں ملا دی اور اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں سے

(۳)

اُس کے پچاس ریوڑ ہیں۔ اُس کا انگور کے ایسا بیضوی چہرہ ہے۔ اُس کے بدن سے کوئی بدن لگا نہیں کھا سکتا۔ جب وہ کالی کمبل میں سے نہا کر نکلتا ہے تو گویا چاند رات میں نمودار ہوتا ہے۔ تمھیں بات چکانی ہی پڑے گی۔
تمھیں کچھ جلدی ہے کیا؟
بہت!
تو پھر اس سے کہہ دینا کہ وہ صرف میرے بالوں ہی سے کھیل سکے گا
بگلی ہوتی ہو کیا؟ میں اسے یہ کیوں کہتی پھروں؟
کیوں کہ آج ہی سویرے وجرما نے اتنی ہی رقم ایک ایسے دلال کے واسطے سے پیش کی ہے جو میرے دل بہلاوے کے لیے اچھا خاصا ہے

(۴)

کون ہے؟
میں ہوں میں، کتنی ہی دیر سے کواڑ بجا رہی ہوں
تمھارا نام کیا ہے؟
مہادیو! مجھے پتا ہے کہ تم میری آواز کو پہچان گئی تھیں
پہچان تو میں گئی ہی تھی، کیوں کہ تمھارے ہی بچے دیکھ رہی تھی
تو لو، میں بھی آ ہی پہنچی
لیکن اب تمھاری کوئی ضرورت نہیں، بچے ہی میرے لیے کافی ہیں

(۵)

اری دیا متی! تو تو سب کچھ جانتی ہے، یہ جوان مجھے کیوں تاکتے ہیں؟
میں ہوا کے مخالف ہو کر چلتی ہوں یہاں تک کہ میرا لہنگا بدن سے چمٹ جاتا ہے، لیکن وہ راستہ کاٹتے ہوئے اپنی راہ چلے جاتے ہیں۔ میں کون سا جتن کروں کہ وہ یہ جان لیں کہ میں اب جوان ہوں؟
تمھیں انھیں یہ دھیان دینا چاہیے کہ تم پریم کی باتیں جانتی ہو۔
کیسے؟
اپنے دل کے جوش اور لگن سے۔
میرا یہ مطلب نہ تھا۔ میں تو کہتی تھی کہ میں انھیں اپنی جوانی کیوں کر جتاؤں؟ ایک دن وہ دیکھیں گے کہ تم ہوا کے مخالف ہو کر نہیں چلتی ہو اور تم نے اپنے لہنگے میں بے شمار چھپانے والی تہیں ڈالی ہیں۔

(۶)

قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اس نے تمھیں دھوکا دیا۔ وہ تاراتی کے ساتھ تھا کہ اوپر

میراجی

سے میں جا ٹکی۔ اور کل اس نے میرے سینے کو چھوا، اور آج صبح اس نے مجھے زبردستی چوم لیا اور میرے ہونٹوں کو گھائل کر دیا۔

تم جھوٹ کہتی ہو!

تو یہ زخم دیکھ لو

مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں، میں انہیں چوس کر دیکھوں گی، چوس کر مجھے چوسنا ہی پڑے گا!

(۷)

سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیسے اس رسیا پریمی کو دروازے سے باہر رکھتی ہو اور وہ گیت گاتا رہتا ہے۔ اس سے تو وہ اپنے پیارے گیت بالو پر ہی لکھ آئے تو اچھا ہے، کیوں کہ تم تو اس کا مذاق اڑانے کے لیے اپنی تمنا کو وہ گیت سکھا دیتی ہو۔ وہ نوجوان تو ذہن دولت والا ہے اور ہمیں روپے پیسے کی ضرورت ہے۔

(۸)

پھر اس نے کیا کیا؟

اس نے تازہ گھاس کا ایک تکیہ بنا کر میرے سر کے نیچے رکھ دیا اور آپ دودھ لینے چلا گیا

اور تم یوں ہی سوتی رہیں؟

تم بھی کیا نادان ہو! میں اٹھی اور میں نے دادلی کی ایک ٹہنی توڑی اور اپنے ہونٹوں کو چھال سے سرخ کیا اور جنگلی دانکھ سے اپنے پپوٹوں کو نیلا بنایا اور بڑے بڑے کنول کے پھولوں سے ہراوہ لے کر اپنی چھاتیوں پر چھڑک لیا۔

مشاہدات

(۱)

وہ اسے بتانے آیا کہ وہ اسے چھوڑ دے گا، کیوں کہ اسے کسی اور سے پریم ہے۔ وہ روئی۔ اس نے اپنے بالوں کو ایک نئے انداز میں بنا رکھا تھا اور وہ اس نئے انداز کے متعلق بغیر کچھ کہے چلا گیا۔

(۲)

اس نے اس کے چہرے کو، اس کے سینے کو اور اس کے بازوؤں کو بوسوں سے ڈھانپ دیا اور پھر وہ چلا گیا۔ چوں کہ اس نے اس کے منہ کو چومنے کی ہمت نہ کی، اس لیے اب وہ اپنے کانپتے ہوئے بازوؤں پر اپنے ہونٹ پھرا رہی ہے۔

(۳)

پوست کا وہ پھول جسے کھلنے میں دیر لگتی ہے، ہوا کا ایک جھونکا اس کی پتیوں کو کھول دیتا ہے! محبت ایک لڑکی کی روح کو اچانک ایک پھول کی طرح کھلا دیتی ہے۔

(۴)

دیکھنا! یہ بسنت کی ہوائیں جو صبح سویرے کنول کی خوشبو سے بوجھل ہیں۔ اس لڑکی کے ماتھے سے چمکتے ہوئے پسینے کو کس طرح صاف کر دیتی ہیں اور کسی پریمی کی طرح اس کے گھونگھٹ کو چھیڑتی ہیں اور اس کی خنکی اسے واپس دے دیتی ہیں۔

(۵)

میں اس چٹیلی اور رس بھری آواز کو زیادہ اچھی طرح سننے کے لیے گھر سے باہر نکل آیا ہوں۔ یہ آواز جو کھیتوں کو چوم رہی ہے، یہ آواز تو گویا کسی عورت کی آواز ہے۔ حرارت سے لبریز اور سنجیدہ محبت میں ڈوبی ہوئی! لیکن یہ تو بند ہو گئی۔ بلبلیں آج رات چپ ہی رہی ہیں۔

(۶)

...اور وہ عورتیں جنھوں نے اپنی بنسریاں توڑ دی ہیں، پایاب پانی کے کنارے سپنے دیکھنے کو جاتی ہیں۔

(۷)

آرزو، احساس اور بے صبری سے لرزتے ہوئے وہ لمبے سفر کے بعد اپنی محبوبہ کے مکان میں داخل ہوا اور اس نے دیکھا کہ اس کی سکھیاں اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ اس کی سکھیوں کو اپنی ملاقات بڑھانے میں ایک تیکھا مزہ آتا تھا، لیکن اس کی محبوبہ اس سے بھی زیادہ مشتاق تھی، اور یہ چلاتے ہوئے "اوئی! یہ کیا کاٹ گیا؟" اس نے اپنا گھونگھٹ اٹھایا اور اس گھونگھٹ سے اس اکیلے دیے کی لو کو بجھا دیا جو وہاں جل رہا تھا اور اندھیرے کی وجہ سے اس کی سکھیاں رخصت ہو کر چل دیں۔

(۸)

مردوں کی باتیں:

تم تو بے وقوف ہو، اگر وہ نہ مانی تو یہ رونا دھونا کیسا؟ آنسو پونچھو اور چنبیلی کے پھولوں سے اپنے سر کو سجاؤ۔ اس کی داسی کے دیس کا کوئی گیت گاؤ کیوں کہ وہ داسی بھی تو سندر ہے۔ اپنی مالکن سے زیادہ سندر ہے۔ وہ بہت جلد مان جائے گی، اور اپنی مالکن کی سختی کا کفارہ ادا کر دے گی۔

جاؤ جاؤ، مجھے چھوڑ دو، مجھے تو داسی سے ہی محبت ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔

وہ داسی بڑی سندر ہے۔

صرف سندرتا ہی کافی نہیں ہوتی۔

اس کی چھاتیاں، اس کی آنکھیں

وہ کس دیس کی ہے؟

مہاپورہ کی

شاید وہ میرے بھائی کو جانتی ہو۔ میرا بھائی بھی تو وہیں کہیں پاس ہی رہتا ہے۔ چوں کہ تم کہتے ہو اس لیے میں گیت گا کر اسے گھر سے باہر بلاؤں گا

مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ تمہیں اپنے بھائی سے اتنا پریم ہے، اچھا رام بھلا کرے!

(۹)

اُسے اس شام کا دھندلکا یاد ہے، جب اس نے پھولوں سے لدے پودے کے سائے میں اسی کے پریم کی قسم اٹھائی تھی۔ اسے اس کی بے وفائی بھی یاد ہے، اس کا جھوٹ، اس کا بے رخی سے چلے جانا اور وہ خوش ہے کہ وہ ایسے آدمی کے پھندے سے بچ گئی، لیکن چاندنی میں پیڑ پر کھلے ہوئے پھول اسے ہمیشہ دھندلے ہی نظر آتے ہیں۔

(۱۰)

بجلی کو رتھ بادلوں پر گڑگڑا رہا ہے۔ اب قریباً اندھیرا چھا چکا ہے۔ اور لو، برسات بھی آن پہنچی۔ آؤ سندری! میرے اس پیڑ کے نیچے پناہ لے لو۔ میں تو تمہیں تمہارے اس نئے لہنگے کے خراب خراب ہو جانے کے خیال سے یہاں پناہ لینے کو کہہ رہا ہوں اور میرے پیڑ کی ٹہنیوں میں جو پنچھی چھپا بیٹھا ہے اس کے خیال سے کہہ رہا ہوں کیوں کہ اس پنچھی نے کبھی ایسا موقع نہیں دیکھا کہ ایسے طوفان سے کسی مرد اور عورت نے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔

افسوس! افسوس! مجھے تمہاری بات ماننا پڑے گی... لیکن اس کے باوجود پنچھی جلد ہی اڑ گیا!

(۱۱)

گہرے نیلے کنول کی بجائے اس کی ایک نظر، چنبیلی کے پھولوں کی بجائے اس کے مسکراتے ہوئے روشن منہ کے دانت، پیالے کی بجائے اس کی ایک ہنستی ہوئی چھاتی ــــ اور وہ یوں اس موسم پر کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اس کے لوٹ آنے کی دھوم دھام منا رہی ہے۔

(۱۲)

"تم گھونگھٹ کے بغیر زیادہ سندر دکھائی دیتی ہو"۔ اور اس کا بے صبر ہاتھ کمر کی طرف سرکتا ہے۔ نوجوان لڑکی کی آنکھوں میں ایک چمک جاگ اٹھتی ہے اور اس کی سکھیاں اور داسیاں دانش مندی سے کام لیتے ہوئے وہاں سے چل دیتی ہیں۔

(۱۳)

بھوانی، امبالکا اور روحنی نے اپنے مسکراتے ہوئے چہروں کا عکس پانی میں دیکھا، اور بھوانی یہ پکارتے ہوئے کہ مجھے تو پیاس لگی ہے، اس سنہرے دائرے پر جھکی جو روحنی کا چہرہ تھا اور اس نے اسے چوم لیا جب وہ دائرہ لرزتا ہوا سطح پر تیر رہا تھا، اور امبالکا رونے لگی۔

(۱۴)

وہ پربت کے دھارے کو دیکھتی ہے جہاں اس کا پریمی اپنے ریوڑ کو رکھتا ہے اور کہتی ہے: "اے دھارے! اے ندی! کیا تو نے اسے دیکھا ہے؟" اور دھارا اپنے منہ سے جھاگ چھوڑتے ہوئے کہتا ہے: "میں نے تو نیلے آسمان اور سفید چٹانوں کو دیکھا ہے"۔ "کیا تو نے بنسری کی تان سنی ہے؟" "میں نے تو چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی ہوا کا شور سنا ہے"۔ "اے دھارے! اے ندی! کیا تو نے کسی منڈلاتے ہوئے عقاب کو دیکھا ہے؟" دھارا کہتا ہے: "میں نے عقاب کو دیکھا ہے"۔ اور وہ کہتی ہے: "میں خوش ہوں کہ تو نے اس عقاب کو دیکھ لیا جس نے اُسے دیکھا ہے"۔

(۱۵)

اے اگنی کہ جس سے بڑھ کر شکتی والے صرف اندر مہاراج ہیں! اے قدرت کی حرارت! برفانی پہاڑوں سے جھلکتی ہوئی، ستاروں کے چمکتے ہوئے گھیرے سے بہتی ہوئی، اگنی، اگنی، اگنی! تجھ میں ہزاروں کنول تمتماتے ہیں۔ تو لوہے کو سرکنڈوں کی طرح موڑ دیتی ہے۔ تو ناچنے والوں کے دلوں میں جوت جگائے ہوئے ہے۔ اُن غزالوں کے لہو میں بھڑک رہی ہے جو شکاریوں کے آگے آگے ہانپتے ہوئے قلانچیں بھرتے چلے جاتے ہیں۔ تو چمکتے ہوئے پریمی اور پریتم کے بازوؤں میں ہے۔ اگنی، اگنی، اگنی!

(۱۶)

سندر کی کنٹھی نے اپنی آواز کے تیر کو رات پر ڈھیلا چھوڑ دیا ہے اور تیز تیز سائے گزر رہے ہیں۔ وہ جو چاندی کے پازیبوں کی جھنکار سنائی دے رہی ہے وہ پرتھا ہے اور وہ اداس گیسوؤں والی جو نینا ہے۔ وہ اوما ہے اور وہ گوتمی ہے۔ جلد ہی وہ لوٹ آئیں گی، اور ہر ایک کے پاس نیلوفر کے پتے میں منقلب پکا ہوا ایک ایک کوئلہ ہو گا، اور ہمیشہ کی طرح پرتھا کے کوئلے میں گھاس پری کی اوس جذب ہو جائے گی، کیوں کہ وہ پیار دینے کے لیے کوئلے کو زمین پر رکھ دیا کرتی ہے۔

(۱۷)

بھوانی اور پرتھا سرگوشی کر رہی ہیں۔ وہ کیا کہہ رہی ہیں؟ "اوہ! اب پرتھا دوڑ پڑی۔ وہ کہاں جا رہی ہے؟" اب اس کے پازیبوں کے ننھے ننھے گھنگھروؤں کی آواز نہیں آ رہی۔ بہت دور، وہاں دیکھنا۔ دو لڑکیاں ایک دوسرے کا منہ نوچ رہی ہیں اور ایک نوجوان مرد گھنڈا ایک پھول کی پتیاں توڑ رہا ہے۔

(۱۸)

بنسریاں چپ ہو گئیں۔ الھڑ لڑکیاں رو رہی ہیں۔ پھول مسلے گئے۔ طوفان آ گیا۔

(۱۹)

اے صبح سویرے کی صورت والی موت!

اے پھولوں کے تاج والی موت!

اے وہ کہ جو ازل سے آج تک ہر مرد اور عورت کے جسم کو اپنی آغوش میں لینے کی مستی میں چور ہے! اے وہ کہ جس کے ہونٹوں پر مہر لگی ہے! اے موت کہ جو گرے ہوئے شکستہ رقاصوں کی تسلیم و نیاز سے بہری ہے! اے صبح سویرے کی صورت والی موت!

یہاں امارو کی پریم کتھا ختم ہوتی ہے۔

اس بات کے باوجود کہ ہمیں صرف امارو کا نام معلوم ہے اور اس کی یہ نظمیں اور انداز اس کا زمانہ، ہم ان نظموں ہی سے اس کی زندگی کے متعلق بہت کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اور 'مشاہدات' کے حصے میں تو (جیسے میرے خیال میں ذاتی نظمیں کہا جا سکتا ہے، اگرچہ ان کا انداز خارجی ہے) ہمیں زندگی کے متعلق امارو کے خیالات کی بھی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً پہلی نظم سے پتا چلتا ہے کہ امارو کے خیال میں مرد کی ذات بے وفا ہے۔ چھٹی نظم میں بھی ناقابل فہم طریق پر یہی خیال جھلک رہا ہے۔ آٹھویں نظم میں تو علی الاعلان مردوں کو معتوب کیا گیا ہے۔ نویں نظم سے عورت کی وفاداری ظاہر ہے۔ اور آخری نظم میں اچانک ہمیں اس کتھا کے انجام پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ رنگ رلیاں اور یہ عیش و عشرت بھی تک ہیں کہ سانس چل رہی ہے۔

گویا یہ تمام نظمیں مل کر زیر لب یہ کہتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں کہ

ساقیا! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

●○■

اردو دُنیا

دہلی یونیورسٹی اردو، پنجابی اور دیگر زبانوں کے تحفظ کو یقینی بنائے

متعلقہ زبانوں کے دانش وروں کی شکایت کے بعد قومی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین وجاہت حبیب اللہ کی ہدایت

نئی دہلی (یکم جولائی)۔ قومی اقلیتی کمیشن نے دہلی یونیورسٹی کو ہدایت جاری کی ہے کہ وہ اپنے چار سالہ کورس میں ترمیم کرتے ہوئے اردو، پنجابی اور دیگر اقلیتی زبانوں کو آپشنل قرار دے اور تمام کالجوں میں ان زبانوں کا آنرس کورس شروع کرے تاکہ ان زبانوں سے متعلق شعبوں کے بند ہوجانے کے خطرے کو ٹالا جاسکے اور ملک کی مشترکہ تہذیب اور کلچر کی امین زبانوں کی تعلیم جاری رہے۔

اردو، پنجابی، بنگلہ، اڑیہ، تمل اور دیگر علاقائی زبانوں کے دانشوران کی جانب سے گزشتہ ہفتہ قومی اقلیتی کمیشن میں درخواست دے کر یہ شکایت کی گئی تھی کہ دہلی یونیورسٹی کے ذریعے بی اے کا پاس کورس ختم کردینے اور چار سالہ کورس شروع کردیے جانے کے بعد ان زبانوں کی تعلیم کے لیے تو خطرہ پیدا ہو ہی گیا ہے ساتھ ہی ان زبانوں سے متعلق شعبے بھی بند ہونے کے دہانے پر ہیں، اس لیے قومی اقلیتی کمیشن اس معاملے میں فوری قدم اٹھاتے ہوئے اقلیتی اور علاقائی زبانوں کے تحفظ کو یقینی بنائے جس کے بعد قومی اقلیتی کمیشن نے دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو طلب کیا تھا لیکن کسی وجہ سے وہ نہیں آئے اور انھوں نے ڈپٹی رجسٹرار کی آروت کو بھیج دیا۔

لوک نائک بھون واقع اقلیتی کمیشن کے دفتر میں چیئرمین وجاہت حبیب اللہ کی صدارت میں ہوئی میٹنگ میں ڈاکٹر مولا بخش، انور پاشا، ڈاکٹر ساجد حسین، ڈاکٹر رویندر سنگھ اور دیگر افراد سمیت کئی لکچرار اور پروفیسروں نے دہلی یونیورسٹی کے تازہ کورس کے نفاذ کے بعد اپنے خدشات اور وسوسوں کا اظہار کیا۔ ان لوگوں نے بتایا کہ جہاں اب تک پاس کورس پڑھایا جارہا تھا وہاں ڈپارٹمنٹ ہی ختم ہوجانے کے حالات پیدا ہوگئے ہیں۔ آئین میں اقلیتی اور علاقائی زبانوں کے تحفظ کی گارنٹی دی گئی ہے اور اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ یہ زبانیں ملک کی مشترکہ تہذیب اور ثقافت کا حصہ ہیں، اگر انھیں ختم کردیا گیا تو ملک کے کلچر کا کیا ہوگا۔ وجاہت حبیب اللہ نے ان سب کی باتوں کو بغور سنا اور انھوں نے دہلی یونیورسٹی کو ہدایت جاری کی کہ وہ حال ہی میں نافذ کیے گئے اپنے چار سالہ کورس میں تبدیلی لاتے ہوئے اس میں اردو، پنجابی اور دیگر اقلیتی زبانوں کو آپشنل قرار دے اور جن کالجوں میں ابھی ان زبانوں کے آنرس کورس نہیں ہیں وہاں ان زبانوں کا آنرس کورس بھی شروع کرے، کیوں کہ اگر آنرس کورس شروع نہ کیا گیا تو ان زبانوں کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا۔ ساتھ ہی ان زبانوں سے متعلق شعبے بھی بند ہوجائیں گے۔ انھوں نے واضح طور پر کہا کہ دہلی یونیورسٹی اس طرح کا میکانزم تیار کرے جس سے اردو، پنجابی یا دیگر اقلیتی اور علاقائی زبانوں پر کوئی آنچ نہ آئے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اردو اساتذہ اپنے مطالبات کے ساتھ جلد ہی وزیر اعلیٰ سے ملیں گے

وارانسی (۲۹ جون)۔ یوپی اردو ٹرینڈ اینڈ ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن وارانسی کے ذمہ داران جلد ہی اپنے مطالبات کے ساتھ وزیر اعلیٰ اکھلیش سنگھ یادو سے ملاقات کریں گے۔ اس سلسلے میں ایسوسی ایشن کی ایک میٹنگ سگرا واقع آزاد ہند پارک میں ضلع صدر محمد ظفر انصاری کی صدارت میں ہوئی جس میں اتفاق رائے سے یہ طے کیا گیا کہ اردو اساتذہ اپنے مطالبات کے ساتھ وزیر اعلیٰ سے ملیں اور ان کو اپنے مسائل بتائیں۔ میٹنگ میں مقررین نے کہا کہ (۱) صوبائی حکومت پریشد کے پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کے ساتھ ناانصافی کررہی ہے جب کہ یہ اساتذہ پانچ برسوں سے تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ قاعدے کے مطابق تین سال میں پرائمری اساتذہ کی ترقی جونیئر ہائی اسکول میں ہوجانی چاہیے۔ وارانسی کے ساتھ ساتھ اطراف کے بھی اضلاع میں جونیئر اسکولوں میں اساتذہ کی جگہیں خالی ہیں مگر پھر بھی ہم لوگوں کا پروموشن نہیں ہورہا ہے۔ میٹنگ میں مطالبہ کیا گیا کہ پرائمری اساتذہ کا جلد از جلد جونیئر ہائی اسکول میں پروموشن کیا جائے (۲) پرائمری اور جونیئر ہائی اسکول میں اردو کی کتابیں مہیا کرائی جائیں (۳) سبھی مسلم تہواروں خاص طور سے عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ پر تین دن کی چھٹی کا اعلان کیا جائے۔ (۴) سبھی سرکاری محکموں میں اردو مترجمین کی تقرری کی جائے (۵) اساتذہ کی تعلیمی اور تدریسی کاموں کے علاوہ قومی کاموں میں ہی ڈیوٹی لگائی جائے۔ میٹنگ میں محمد ظفر انصاری، مجیب عالم، احتشام، جاوید احمد، اخلاق احمد، رہ جبیں، ناہید فاطمہ، عبدالرحمن، شائستہ پروین، دیوان پرویز خان، کرشمہ آفریں، شائستہ افروز، ذہرہ جہاں، روبینہ، عارف رحیم اور شاہد منیر خاں خاص طور سے شامل ہوئے۔

(انقلاب۔ دہلی)

تقسیم کی گئی کتابوں میں اردو کی کتابیں ندارد

اناؤ (۱۹ جون)۔ حکومت کی طرف سے پرائمری اور جونیئر ہائی اسکولوں کے غریب بچوں کو ہندی کی کتابیں تقسیم کرانے کے لیے بھیجی گئی ہیں لیکن اردو پڑھنے والے طلبہ وطالبات کے لیے اردو کی کتابیں نہیں بھیجی گئی ہیں۔ ریاستی حکومت ہر سال پرائمری اور جونیئر ہائی اسکول میں طلبہ اور طالبات کو ہندی کی کتابیں مفت تقسیم کراتی ہے۔ ہندی کتابوں کا ذخیرہ اناؤ کے اسٹور میں اتارا جاچکا ہے لیکن ان ہندی کتابوں میں اردو کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ جب اس بابت محکمۂ تعلیم کے ملازمین سے بات کی گئی تو انھوں نے بتایا کہ صرف ہندی کی ہی کتابیں آئی ہیں انھیں اسکولوں میں تقسیم کرایا جارہا ہے۔ خیال رہے کہ ریاستی حکومت ہر سال اردو پڑھنے والے طلبہ و طالبات کو اردو کی کتابیں مفت تقسیم کرنے کا ڈھنڈورا پیٹتی ہے لیکن ابھی تک ضلع کے کسی بھی پرائمری اور جونیئر اسکول کے طلبہ وطالبات کو اردو کی کتابیں نہیں ملی ہیں۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

انجمن ترقی اردو کی کاوشوں سے ناگپور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کا قیام

ناگپور (ڈاک سے)۔ راشٹرسنت تکڑوجی مہاراج ناگپور یونیورسٹی ناگپور کو حکومت مہاراشٹر کی جانب سے اردو شعبے کے قیام کی منظوری مل گئی ہے، جس سے علاقہ ودربھ کے اردو داں طبقے میں خوشی و مسرت کی لہر دوڑ گئی ہے۔

واضح ہو کہ راشٹرسنت تکڑوجی مہاراج ناگپور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے قیام کا مطالبہ عرصہ دراز سے کیا جارہا تھا۔ ۲۰۰۵ء میں اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر ایس این پٹھان کی رہنمائی میں اردو شعبے کی تجویز حکومت مہاراشٹر کو پیش کی گئی۔ اس سلسلے میں انجمن ترقی اردو ناگپور کے سکریٹری ڈاکٹر اطہر حیات نے مختلف وقتوں میں مہاراشٹر کے مختلف وزیر اعلا اور وزرا کی خدمت میں میمورنڈم پیش کیا۔ محترمہ سونیا گاندھی، جناب منموہن سنگھ، جناب راہل گاندھی، جناب سلمان خورشید اور جناب کے رحمن جیسے مرکزی وزرا کو بھی اس سلسلے میں خطوط روانہ کیے۔ حکومت مہاراشٹر کے سابق ایم ایل سی جناب انیس کیو زمان کا رول بھی اس سلسلے میں قابل قدر اور لائق تحسین ہے۔ انھوں نے مسلسل وزیر اعلا کی توجہ اس طرف مبذول کروائی۔ وزیر اوقاف جناب عارف نسیم خان کی خصوصی توجہ سے اردو طبقے کو ان کا حق مل پایا۔ اس کے علاوہ اس سلسلے میں اسٹیچول فورم ناگپور کے صدر ڈاکٹر شکیل ستار کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ موصوف کامرس کے پروفیسر ہیں لیکن انھوں نے اردو شعبے کے قیام کے سلسلے میں خلوص دل سے جدوجہد کی۔ آخرکار حکومت کی جانب سے ناگپور یونیورسٹی میں اردو شعبے کے قیام کی منظوری مل ہی گئی۔ حکومت کے اس فیصلے سے علاقے میں اطمینان کا اظہار کیا گیا۔

ناگپور یونیورسٹی کے ملحق کالجوں کے اساتذہ نے گزشتہ دنوں آر ٹی ایم ناگپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ولاس سپکاڑ سے ملاقات کی اور انھیں ہدیۂ تبریک پیش کیا۔ ناگپور یونیورسٹی میں بورڈ آف اسٹڈیز کے چیئرمین ڈاکٹر اطہر حیات کی قیادت میں اساتذہ کے ایک وفد نے وائس چانسلر صاحب کی خدمت میں گلدستہ پیش کیا اور انھیں مبارک باد دی۔ اس موقعے پر یونیورسٹی کے رجسٹرار گوماشے بھی موجود تھے۔

وائس چانسلر ڈاکٹر ولاس سپکاڑ نے فرمایا کہ سال رواں ۱۴-۲۰۱۳ء سے یونیورسٹی میں اردو شعبے کا قیام عمل میں آجائے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ وہ شعبے کو ریسرچ میں ملنا چاہیں گے۔ اس سلسلے میں موصوف نے یونیورسٹی کی طرف سے ہرممکن مدد کا یقین دلایا۔

انجمن ترقی اردو بیدر کا ادبی جلسہ

بیدر۔ ۱۷ جون (پریس ریلیز) اردو زبان کی شیرینی اور اس کی اہم خدمات کے باوجود اس زبان کو ہر سطح پر نظرانداز کیا جارہا ہے۔ ممتاز بزرگ شاعر اور ماہر تعلیم جناب نثار احمد کلیم نے کل شب زنگل پورہ بیدر میں انجمن ترقی اردو بیدر کی جانب سے منعقدہ ادبی نشست میں یہ باتیں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو ایک قومی کردار ہے، جنگ آزادی میں دلوں کو جوڑنے کا کام اردو نے کیا۔ آج بھی اردو زبان ہندوستان کے طول و عرض، شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ جلسے میں کرناٹک اردو اکیڈمی میں بیدر سے نمائندگی کے لیے مباحثہ ہوا جس میں فراست علی ایڈوکیٹ، صحافی محمد امین نواز، غوث قریشی، سید نوازش علی، صحافی عبدالصمد منجو والا، باسط خاں صوتی، محمد امیرالدین امیر وغیرہ نے حصہ لیا۔ سبھوں کا مشترکہ خیال تھا کہ عرصہ دراز سے کرناٹک اردو اکیڈمی میں بیدر کو نمائندگی نہیں دی گئی۔ بیدر کو اس بار اگر نمائندگی نہیں ملتی ہے تو ہم یہ سوچنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ہمارے خلاف منصوبہ بند سازش کی جارہی ہے۔ بعد ازاں نثار احمد کلیم کی زیر صدارت شعری نشست منعقد ہوئی جس کے مہمان خصوصی سید احمد قادری اور مہمان اعزازی محمد امیرالدین امیر رہے۔ منور علی شاہد میر بیدری، باسط خاں صوتی، امیرالدین امیر اور نثار احمد کلیم نے اپنا اپنا کلام پیش کیا۔ آخر میں ایک قرارداد پیش کی گئی، بیدر میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد (مانو) کے کیمپس کے قیام سے متعلق تھی جس میں ڈپٹی کمشنر بیدر اور رکن پارلیمان دھرم سنگھ سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ مانو کے سٹیلائٹ کیمپس کے آغاز کے ذریعے اردو ذریعہ تعلیم سے پڑھنے والے طلبہ کا تعاون کرتے ہوئے اپنے اردو دوست ہونے کا ثبوت دیں۔

ڈی ڈی اردو نشریات کو بہتر بنانے کے لیے مثبت اقدام

نئی دہلی (۲۳؍جون)۔ پرسار بھارتی کے سربراہ نے یقین دلایا ہے کہ ڈی ڈی اردو کی نشریات کو بہتر بنانے کی کوشش کی جارہی ہے اور اس کی ترقی اور فروغ کے لیے مثبت اقدام کرنا ہماری ترجیحات میں شامل ہیں۔ وہ یہاں ڈی ڈی اردو کے مسائل پر منعقد ایک میٹنگ میں اظہار خیال کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ایک سال میں ڈی ڈی اردو میں کچھ بہتر تبدیلیاں آئیں گی۔ اس میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے دور درشن کے ڈائرکٹر جنرل ترپواری شرن نے کہا کہ جلد ہی ڈی ڈی اردو کو بہتر بنانے کے لیے کئی اقدام کیے جارہے ہیں اور آج کی میٹنگ اسی سلسلے میں بلائی گئی ہے۔ انھوں نے یقین دلایا کہ میٹنگ میں دیے گئے مشوروں کی رہنمائی میں ڈی ڈی اردو چینل میں اصلاح اور ترقی کا ہمارا عزم سفر جاری رہے گا۔ معزز شرکا نے نہ صرف میٹنگ کے انعقاد کو خوش آئند بتایا بلکہ ڈی ڈی اردو کے فروغ و استحکام کے لیے مفید مشوروں سے نوازا، جن میں انفراسٹرکچر ڈیولپمنٹ، درست اردو جاننے والوں کی شمولیت، اردو اخبارات سے بہتر تال میل، ملک بھر سے اردو کی سرگرمیوں کی کوریج، حالات حاضرہ، سماجی مسائل اور سائنس و دیگر معلوماتی شوز کے علاوہ اردو سکھانے کے پروگرام وغیرہ شامل ہیں۔

اس میٹنگ میں سی ای او جوہر سرکار، دور درشن کے ڈائرکٹر جنرل ترپواری شرن کے علاوہ ڈی ڈی نیوز کے ڈی جی ایس ایم خان، ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرل رنجنا چندرا، وی کے بھین، ڈی ڈی اردو کے ایڈوائزر آصف اعظمی اور انور جمال کے ساتھ ساتھ ملک بھر سے تشریف لائے اردو اداروں، میڈیا اور بیورو کریسی سے وابستہ معزز شخصیات نے شرکت کی جن میں احمد سعید ملیح آبادی، مولانا محمد ولی رحمانی، ترنم ریاض، تبسم مشرا، سید شاہد مہدی، ڈاکٹر محمود الرحمن، ڈاکٹر انیس انصاری، پروفیسر مشیر الحسن، آر پی سنگھ صدام، افضل، وید بھسین، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر آلوک رائے، ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین، ڈاکٹر ظہیر قاضی، حسن کمال، ظہیر الدین علی خان، شفیع مشہدی، گوہر رضا، جمیل منظر، ڈاکٹر عزیز احمد، شائستہ یوسف اور عازم گروبندر سنگھ کوہلی شامل ہیں۔ میٹنگ میں ابتدائی کلمات اور تعارف ڈی ڈی اردو کے ایڈوائزر آصف اعظمی اور کلمات تشکر انور جمال نے پیش کیے جب کہ ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرل رنجنا چندرا نے استقبالیہ کے فرائض انجام دیے۔ (راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

تین درجن نصابات کو منظوری

خواجہ معین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل کی میٹنگ میں فیصلے

لکھنؤ (۲۸؍جون)۔ خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی، فارسی یونیورسٹی لکھنؤ کی اکیڈمک کونسل کی تیسری میٹنگ وائس چانسلر ڈاکٹر انیس انصاری کی صدارت میں ۲۵؍جون کو رام منوہر لوہیا لا یونیورسٹی کے میٹنگ ہال میں ہوئی جس میں تعلیمی سال ۱۴-۲۰۱۳ء کے لیے مختلف درجات کے نصابات منظور کیے گئے۔ میٹنگ کے بعد وائس چانسلر ڈاکٹر انیس انصاری نے بتایا کہ اس سال بی اے (پاس) اور بی اے (آنرس) اردو، عربی، فارسی، انگریزی، ہندی، تاریخ، جغرافیہ، ہوم سائنس، اقتصادیات، سیاست، جسمانی تعلیم، کمپیوٹر ایپلی کیشن، ایجوکیشن، مینجمنٹ کے علاوہ بی ایس سی (ہوم سائنس)، بی کام، بی ٹیک، ایم سی اے، ایم بی اے، ایم بی ای، ایم سی اے، ایم اے (ایجوکیشن)، ایم اے (اردو)، بی پی ایڈ، ایم پی ایڈ اور پی ایچ ڈی کی منظوری دی گئی۔ ڈاکٹر انصاری نے یہ بتایا کہ دو ڈپلومہ کورسز میں ڈانس ایجوکیشن، اردو صحافت، ہندی صحافت، کاپی رائٹ، آثار قدیمہ، سیاحت اور فارسی آثار قدیمہ، فارسی صحافت اور ماسٹر ڈگری، جنیٹکس ٹیکنالوجی اور خطیو گرافی، امیر اداری، ٹرانسلیشن اور انٹرپریٹر (عربی)، ڈپلومہ ان الیمنٹری ٹیچرس ایجوکیشن، نرسری ٹیچرس ٹریننگ ہندی، کمپیوٹر اکاؤنٹنگ ای آر پی، سائبر سکیورٹی، ملٹی میڈیا اور اینیمیشن، اسپورٹس جرنلزم، اسپورٹس فوٹو گرافی، اسپورٹس انفراسٹرکچر، فٹنس سینٹر مینجمنٹ، اوڈ پچرس اسپورٹس اور ریکریشن سینٹر مینجمنٹ کی منظوری دی گئی۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے علاوہ مرکز برائے تصوف، ہندستانی مذاہب اور تہذیب کے تقابلی مطالعے کا قیام بھی زیر غور ہے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اردو میڈیم اسکول کا قیام ضروری

ارریا (۲۸؍جون)۔ جمعیت علمائے ہند ارریہ کے صدر جناب عبدالغفار نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں کے اس اعلان کا خیر مقدم کیا ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ مسلم اکثریت والے علاقوں میں اردو میڈیم اسکول کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ ارریہ ضلع بڑے مسلم اکثریتی آبادی والا علاقہ ہے جو ملک کے ان 90 ضلعوں میں اور بہار کے 8 ضلعوں میں شامل ہے جسے حکومت نے انتہائی پس ماندہ مسلم اکثریتی علاقہ قرار دیا ہے۔ عبدالغفار صاحب نے کہا کہ ہم وائس چانسلر کے اس فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہیں اور خواہش کرتے ہیں کہ وہ ایک بار ارریہ تشریف لائیں اور یہاں کے حالات کا جائزہ لے کر اردو میڈیم اسکول قائم کرنے کی پہل کریں۔ انھوں نے کہا کہ اس سلسلے میں زمین مہیا کرائی جائے گی۔ اس کے لیے کوشش شروع کردی گئی ہے۔ بس ان کے توجہ کی ضرورت ہے۔ ان کے ذریعے اردو میڈیم اسکول قائم کیے جانے سے اس علاقے کی ترقی ہوگی اور تعلیمی پس ماندگی بھی دور ہوگی۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

جہان آباد کے دو ملحقہ کالجوں میں شعبۂ اردو برسوں سے بند

جہان آباد (۱۳؍جون)۔ ضلع کے دونوں الحاق شدہ کالجوں میں شعبۂ اردو برسوں سے بند پڑے ہیں، کیوں کہ یہاں ایک بھی اردو لیکچرر موجود نہیں ہیں۔ طلبہ پریشان ہیں جب کہ کالج انتظامیہ اور مگدھ یونیورسٹی کے حکام چین کی نیند سو رہے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ کالج میں مادری زبان اردو یا آپشنل اردو موضوع لے کر پڑھنے والے طلبہ یا تو خود گیس پیپر سے تیاری کرنے پر مجبور ہیں یا پھر اردو کے بجائے دیگر موضوعات لینے میں عافیت محسوس کررہے ہیں۔ مذکورہ خیالات کا اظہار ضلع انصاف کمیٹی کے سکریٹری کامریڈ طارق فتح نے آج نمائندہ سے خصوصی بات چیت میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ ایس ایس کالج میں تقریباً سات برسوں سے اور ایس این کالج میں تقریباً چار برسوں سے شعبۂ اردو میں اساتذہ کی سیٹیں خالی ہیں۔ جو لوگ کالج کے قیام سے لیکچرر تھے وہ یکے بعد دیگرے ریٹائر ہوگئے اور یونیورسٹی نے ان خالی جگہوں کو پُر کرنے کے لیے کسی لیکچرر کی تعیناتی نہیں کی اور نہ کالج انتظامیہ نے اپنی سطح پر کوئی متبادل انتظام کیا۔ انھوں نے کہا کہ تقریباً یہی حالت دوسرے موضوعات کی بھی ہیں، لیکن کالج انتظامیہ نے اس کے لیے متبادل انتظام کررکھے ہیں۔ انھوں نے سوالیہ انداز میں کہا کہ آخر اردو اساتذہ کے متبادل انتظام میں آنا کانی کیوں کی جارہی ہے۔ جب کہ دونوں کالجوں میں بڑی تعداد میں اردو پڑھنے والے طلبہ و طالبات موجود ہیں۔ طارق فتح نے ضلع انتظامیہ سے اس بابت مداخلت کرنے اور شعبۂ اردو کو زندہ کرنے نیز حکومت کے ذریعے مستقل تقرری ہونے تک دیگر موضوعات کی طرح اردو کے لیے متبادل انتظام کے لیے پہل کرنے کی گزارش کی ہے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

ملک الشعرا اعزاز بحال کرنے کے لیے حکومت سے مطالبہ

حیدرآباد (۲۰؍جون)۔ آندھرا پردیش اردو کونسل کے ایک اجلاس میں ریاستی حکومت اور اردو اکیڈمی سے مطالبہ کیا گیا کہ ملک الشعرا کا اعزاز بحال کرتے ہوئے کسی مستحق شاعر کو یہ اعزاز دیا جائے۔ سابق میں یہ اعزاز بحیثیت وزیر اعلا انجیا نے دکن کے ممتاز شاعر حضرت اوج یعقوبی کو عطا کیا تھا۔ تاہم تلگو دیشم کے اقتدار حاصل کرنے ہی سابق وزیر اعلا این ٹی راما راؤ نے مذکورہ اعزاز برخاست کردیا۔ آندھرا پردیش اردو کونسل نے مطالبہ کیا کہ مذکورہ اعزاز کو دوبارہ بحال کیا جائے۔ کونسل نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ اردو اساتذہ کی خالی اسامیاں پُر کرنے، اردو مدارس کی خستہ حالی دور کرنے، تمام سرکاری دفاتر میں کم از کم ایک اردو داں عہدیدار کا تقرر کرنے، اردو درخواستیں قبول کرنے، نیز تمام دفاتر، بینکوں، پارکس، عوامی مقامات اور آرٹی سی بسوں پر اردو تختیاں آویزاں کرنے کے اقدام کو یقینی بنایا جائے۔ اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ مذکورہ امور پر عنقریب ریاستی وزیر اعلا، اقلیتی کمیشن اور اردو اکیڈمی سے نمائندگی کی جائے گی۔

(منصف۔ حیدرآباد)

اردو کی تعلیم نہ ہونے پر تشویش کا اظہار

گوپال گنج (۱۸؍جون)۔ اردو بہار کی دوسری سرکاری زبان ہے۔ ریاستی حکومت نے اردو کی تعلیم کے لیے پرائمری اور مڈل اسکولوں میں ہزاروں اساتذہ کی تقرری کی ہے، لیکن اس کے باوجود اردو کی پڑھائی نہیں ہو پارہی ہے۔ گوپال گنج ضلع کے مانجھا گڑھ بلاک کے کیٹو پور کوردمیں ایک پرائمری مکتب ہے جہاں کئی اساتذہ اردو یونٹ پر بحال کیے گئے ہیں، اردو پڑھنے والے بچوں کی تعداد بھی 90 فیصد ہے اس کے باوجود اس اسکول میں اردو کی پڑھائی نہیں ہورہی ہے اس کے لیے گاؤں والوں نے کئی مرتبہ مذکورہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے رجوع کیا لیکن نتیجہ صفر نکلا۔ اردو ٹیچروں سے شکایت کی گئی تو انھوں نے یہ کہہ کر اپنا دامن بچالیا کہ ہیڈ ماسٹر نے روٹین میں اردو کے لیے گھنٹی مقرر نہیں کی ہے۔ کیٹو پور کورد کے مسلم باشندوں نے ضلع مجسٹریٹ اور ڈی پی او گوپال گنج کو ایک میمورنڈم دے کر گزارش کی ہے کہ مذکورہ اسکول میں اردو کی پڑھائی کو یقینی بنائی جائے تاکہ 90 فیصد مسلم طلبہ و طالبات اپنی مادری زبان سیکھ سکیں۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اک دیا اور بجھا

معروف ادیب اور انشائیہ نگار جناب تمنا مظفر پوری کا طویل علالت کے بعد ۲۰؍مئی ۲۰۱۳ کو پٹنہ میں انتقال ہوگیا۔ وہ 70 برس کے تھے۔ ان کی نماز جنازہ ۲۰؍مئی کو صبح آٹھ بجے سمن پورہ میں دانش اپارٹمنٹ کے احاطے میں ادا کی گئی اور تدفین ویٹرنری کالج کے قریب قبرستان میں عمل میں آئی۔ تمنا مظفر پوری کا اصل نام اسرار احمد تھا۔ ان کی پیدائش ۱۷؍نومبر ۱۹۴۳ کو محمد پور مبارک، ضلع مظفر پور میں ہوئی تھی۔ تمنا مظفر پوری رام دیال سنگھ کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بہار اسٹیٹ شوگر کارپوریشن میں بحیثیت لیبر ویلفیئر آفیسر مقرر ہوئے جہاں سے وہ نومبر ۲۰۰۳ میں سبکدوش ہوئے۔ وہ اردو زبان و بیان اور ادب پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ انھوں نے کئی اہم انشائیے بھی تحریر کیے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : مکتوباتِ اردو کا ادبی و تاریخی ارتقا
مصنف : خواجہ احمد فاروقی
ضخامت : ۳۳۴ صفحات
قیمت : ۱۹۳ روپے
ناشر : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی
تبصرہ نگار : ڈاکٹر خلیق انجم

میرے استاد محترم پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کو ایک اعلا درجے کے محقق، ادیب اور خاص طور پر ممتاز انشا پرداز کی حیثیت سے غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل رہی ہے۔ انھیں ایک ساتھ کئی موضوعات پر عبور حاصل تھا۔ 'اردو مکتوب نگاری کی تاریخ اور ارتقا' ان کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھیں دہلی یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری سے نوازا تھا۔ خواجہ صاحب نے اردو مکتوب نگاری کی تاریخ اور ارتقا کا بہت وسیع مطالعہ کیا تھا۔ اردو مکتوب نگاری پر مختلف ناقدین نے مضامین لکھے ہیں لیکن خواجہ صاحب کی یہ کتاب اردو مکتوب نگاری پر پہلا تحقیقی مقالہ ہے۔ اس مقالے میں اردو مکتوب نگاری کا مرزا رجب علی بیگ سرور سے لے کر مولانا ابو الکلام آزاد تک جائزہ لیتے ہوئے مکتوب نگاری کے رجحانات اور طرزِ تحریر کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ خواجہ صاحب کا خاص رجحان اگرچہ اردو تحقیق کی طرف تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں میں انشا پردازی کے جوہر بھی نمایاں تھے۔ چوں کہ زیرِ نظر کتاب میں انھوں نے اپنی تحقیقی اور انشا پردازانہ دونوں صلاحیتوں سے کام لیا تھا، اسی لیے اس مقالے کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ ایک محقق کی حیثیت سے خواجہ صاحب نے ہندستان میں فارسی انشا کے آغاز اور ارتقا پر اپنی پوری صلاحیتوں سے کام لیا تھا۔ خواجہ صاحب نے محقق کی حیثیت سے شاہ جہاں کے ایک اردو خط کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اورنگ زیب، مرزا جعفر زٹلی کے اردو مکتوبات کی بھی نشان دہی کی ہے۔ خواجہ صاحب نے فورٹ ولیم کالج کے مستشرقین کے اردو خطوط۔ گارساں دتاسی، ڈیوڈ، ڈاکٹر لوئی کے علاوہ اور کئی قدیم مکتوب نگاروں کی بھی نشان دہی کی ہے۔

احسن مارہروی کا خیال ہے کہ اردو مکتوب نگاری کی ابتدا غالب سے ہوتی ہے لیکن پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے بجا طور پر فرمایا ہے کہ اردو مکتوب نگاری کا آغاز رجب علی بیگ سرور اور غالب سے پہلے راسخ عظیم آبادی، یاس آروی، تاثیر عظیم آبادی، مرزا قتیل اور دہلی سے شائع ہونے والے اردو اخبارات میں شائع ہونے والے خطوط سے ہو چکی تھی۔ خواجہ صاحب نے بالکل درست لکھا ہے کہ مکاتیب رجب علی بیگ سرور، تاریخ ادب کا محض حادثہ نہیں ہیں۔ مکاتیب سرور خلا میں وجود پذیر نہیں ہوئے تھے بلکہ وہ اردو مکاتیب کی تاریخ کے ارتقا کی ایک اہم کڑی کی حیثیت سے وجود میں آئے تھے۔ بعض مورخین نے اردو مکتوب نگاری کا ذکر اس انداز سے کیا ہے جیسے رجب علی بیگ سرور سے پہلے اردو مکتوب نگاری کا دور بالکل تاریک تھا۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے ان مکتوب نگاروں سے بھی کل واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط کے کئی مجموعوں کی نشان دہی کی ہے۔ مکتوب نگاری کی تاریخ میں خواجہ صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے رقعات واجد علی شاہ (قلمی)، تاریخِ خزانہ (مطبوعہ)، تاریخ نور شاہی، انشائے راحت روح (مطبوعہ)، تاریخ بدر (مطبوعہ) اور بیگمات اودھ کے خطوط کے مجموعوں کی نشان دہی کی ہے۔

اردو نثر کے ابتدائی نمونے پندرھویں صدی سے ملنے شروع ہوتے ہیں۔ انیسویں صدی تک چار صدیاں گزر جاتی ہیں۔ اگر اس طویل عرصے میں لکھی جانے والی نثری کتابوں کی فہرست مرتب کی جائے جو مخطوطات کی شکل میں ہمیں دستیاب ہوئی ہیں تو پوری کھینچ تان کے بعد بھی ہماری فہرست پچیس تیس کتابوں سے آگے نہیں بڑھتی جب کہ اس کا پورا امکان ہے کہ اردو نثر کے کچھ مخطوطات دستبردِ زمانہ کی نذر ہوگئے ہوں تو اس فہرست میں دس پندرہ کتابوں کا اور اضافہ کر دیجیے۔ یہ سب کتابیں تصوف، مذہب اور اخلاقیات کے موضوع پر ہیں۔ ان میں سے کچھ داستانیں ہیں۔ اردو کا یہ نثری سرمایہ دوسری زبانوں اور خاص طور پر فارسی سے ترجمہ یا ماخوذ ہیں۔

غالب اردو کے جدید نثر نگار نہیں تھے کیوں کہ ان کی نثر نگاری کے آغاز سے تقریباً پچاس سال قبل اردو نثر نگاری میں چار رسالے لکھے جا چکے تھے۔ ان کے علاوہ مختلف کتابوں پر دیباچے، تقریظیں اور کچھ مختلف تحریریں بھی لکھی جا چکی تھیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو نثر نگاری میں غالب کا اصل کارنامہ ان کے خطوط ہیں۔ حالی نے 'یادگارِ غالب' میں غالب کی خطوط نویسی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"مرزا کی اردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط و کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا، نہ ان کے بعد کسی سے پوری پوری تقلید ہوئی۔"

خواجہ صاحب کو غالب سے عشق تھا۔ انھوں نے غالب کی انشا پردازی، مکتوب نگاری اور نثر نگاری پر اعلا درجے کی تحقیق کی تھی۔ زیرِ نظر تحقیقی مقالے میں غالب کی تحریروں کے بارے میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ خواجہ صاحب سے پہلے بہت سے نقادوں نے غالب کے خطوط کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن ایسا تفصیل کے ساتھ جائزہ نہیں لیا ہے۔ خواجہ صاحب نے غالب کے خطوط کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

"غالب کے اردو خطوط میں زندگی اپنی تمام رعنائیوں اور دل کشی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ شاعری میں ہمیں غالب کی آواز کافی دور سے سنائی دیتی ہے۔ لیکن خطوط میں غالب ہمارے ہم نشیں بن کر ہم سے محوِ گفتگو نظر آتے ہیں۔ شاعری میں غالب ہمارے دکھ درد اور ہماری نفسیاتی الجھنوں کا مداوا ایک مفکر، فلسفی، صوفی اور ایک اخلاقی مصلح کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ غالب ہمارے دکھ درد میں ایک حقیقت پسند اور ایک عملی انسان کی حیثیت سے ہماری خوشی و غم میں شریک ہوتے ہیں۔ غالب اپنے خطوط میں ہمیں ایک حساس اور دھڑکتے ہوئے دل یعنی زندگی کے وجود کا احساس ہوتا ہے۔"

غالب کی دنیا بہت وسیع تھی۔ غالب کی گفتگو میں جو خود اعتمادی اور ان کی شخصیت میں جو تاب و توانائی تھی، اس کے لیے شخصیت کا منفرد ہونا ضروری ہے اور منفرد شخصیت اسی کی ہوتی ہے جسے اپنی انا عزیز ہو اور جس نے اپنی انا کی نگہ داری کی ہو۔ جس انسان کی انا میں جتنی زیادہ قوت ہوگی اتنی ہی اس کی انفرادیت کی توجیہ ہوگی۔

■◆■

نام کتاب : جمالِ فن (شعری مجموعہ)
شاعر : صبا نقوی
ضخامت : ۱۱۲ صفحات
قیمت : ۱۵۰ روپے
ملنے کا پتا : اے نور ڈیزائنرز، بھارتی ویئنگ چوک، چاندوار، مظفر پور (بہار)
تبصرہ نگار : ڈاکٹر سید معصوم رضا مشرقی

صبا نقوی کی ذاتِ گرامی اپنے آپ میں ایک انجمن کی حیثیت رکھتی ہے۔ مظفر پور کی ادبی فضا کی راہ ہموار کرنے میں ان کا ایک اہم رول ہے۔ برصغیر میں ایسے شعرا و ادبا کی تعداد بہت کم ہے جن کا سیاست اور درباداری سے کوئی تعلق نہ ہو۔ صبا نقوی کی شخصیت ایسے شعرا کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ انھوں نے صاف ستھرے ادبی ذوق کی ترجمانی کی اور شاعری کو فکری بصیرت کے محور پر مرکوز کر دیا۔ صبا نقوی نے شاعری کی جو بساط بچھائی اسے عملی طور پر ایک تحریک کی شکل بھی عطا کی۔ وہ ان کے تخیل کی بلند پروازی، عمیق مطالعے اور تلاش و جستجو کی کاوش کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے اشعار اظہار کی بلندی کو چھوتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار:

میرے تعلقات کی بنیاد ہے غزل
جانِ غزل سے ربطِ غزل سے لگاؤ ہے

ماورائے عرش ہے میرے تخیل کی اڑان
حرف بے معنی سمجھتا ہوں میں بال و پر کی قید

زندگی کے صحرا میں دور تک گیا ہوں میں
پھر بھی یہ نہیں سمجھا دھوپ تھی کہ سایا تھا

جبرِ وقت کے ماتھے پہ بل پڑے لیکن
دبی زبان سے کچھ عرضِ حال ہو جائے

صبا نقوی نے شاعری کو بطور مشقِ سخن اختیار کیا ہے اور اسے جنون کی حد تک پروان چڑھانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ ان کی شاعرانہ حیثیت کا یہ عالم ہے کہ جہاں لوگوں کے آئے دن شعری مجموعے شائع ہو رہے ہیں وہیں تین دہائیوں کے ادبی سفر کے بعد یہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو زیورِ طبع سے آراستہ ہوا ہے۔ اس میں کچھ تو ادبی دنیا کی ستم ظریفی ہے کہ کہنہ مشق شعرا کے کلام بھی منظرِ عام پر صرف اس لیے نہیں آتے کہ وہ مالی استعداد نہیں رکھتے، دوسری طرف انھیں اپنے شعری احتساب کے بعد جب یقین کامل ہو گیا کہ یہ شعری مجموعہ منظرِ عام پر لایا جا سکتا ہے تب ہی شائع کرایا۔ شعری مجموعہ 'جمالِ فن' کے سرسری مطالعے سے صبا نقوی کی شعری لذتیت سے قاری بھی محظوظ ہو سکتا ہے۔ ان کے اشعار میں رعایتِ لفظی اور نئی نئی ترکیبات کی سلیقہ مندی جا بجا نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار:

میں اپنے دائرے میں ہوں مگر تم سے مخاطب ہوں
تمھاری عقل سے ہے میرے دل کی بات کا رشتہ

جب بھی ہم سنبھالیں گے تیشۂ قلم اپنا
فکر و فن کی دنیا میں جوئے شیر لائیں گے

باقدریِ افکار کے اس دورِ قلق میں
مائل بہ قلم دستِ ہنر ہے کہ نہیں ہے

صبا نقوی کی غزلوں میں عشقیہ جذبات کی کارفرمائی بخوبی نظر آتی ہے لیکن ان کا تصورِ عشق پاکیزہ ہے۔ ان کی غزلوں میں صرف دل کی چاہت کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ان کی غزلوں میں بھی وہی محبوب ہے جس کی قربت کا ذکر ہر قدیم و جدید شعرا کے یہاں ملتا ہے۔ شاعر اپنے محبوب کے حسن کے گرویدہ ہیں، ملاحظہ ہوں یہ چند اشعار:

رات میرے خوابوں میں جانے کون آیا تھا
دیکھنے میں اپنا تھا اصل میں پرایا تھا

ہم نے اک وفا کر کے سیکڑوں سزا جھیلی
سو جفائیں کر کے تم بے قصور ہو بیٹھے

باہر سے مطمئن ہے کوئی ہم سے چھوٹ کر
اندر سے رو نہ جائے کہیں ٹوٹ پھوٹ کر

صبا نقوی نے اپنی غزلوں میں زمانے کے دکھ درد کی ترجمانی بھی کی ہے اور اپنے دکھ درد کا ازالہ بھی کیا ہے۔ وہ مشکل حالات سے روبرو ہو کر بھی پرسکون ماحول میں زندگی بسر کرنا جانتے ہیں۔ درپیش مسائل اور زمانے کی ناانصافیوں اور نامہربانیوں سے انھیں شکوہ تو ہے مگر انھوں نے بلند ہمتی اور اعلا ظرفی سے کبھی منہ نہیں موڑا بلکہ وہ اعتماد کی حدوں تک پہنچنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں یہ چند منتخب اشعار:

عزم پختہ ہو تو کچھ مشکل نہیں اس کا دفاع
خام ہو ہمت تو پھر اک سیلِ اشکِ بے وجہ

وہ کون ہے کہ جس کی طرف آج بھی صبا
میرے تمام فکر و نظر کا جھکاؤ ہے

جسے لیاقت ابجد نہیں وہ عاقل ہے
جو کور ہیں ہے وہی صاحبِ نظر ہے یہاں

زمانہ ساز رفیقوں سے پوچھتا ہوں میں
وفا کا رنگ ہے تصویرِ دوستی میں کہاں

صبا نقوی کے شعری لہجے میں خلوص اور حیات و کائنات کے سارے عوامل شامل ہیں جو انھیں علمی لیاقت اور تجربات کے وسیلے سے ملے ہیں۔ سیدھی سادی طبیعت کے باوجود غزلوں میں لفظیات کا طلسم سر چڑھ کر بولتا ہے۔ الفاظ سے ترنم بکھیرنے اور کشش پیدا کرنے کا فن انھیں بخوبی آتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں ذہن و دل کو متاثر کرتی ہیں۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار:

سکوتِ نیم شبی سے کہو گواہ رہے
ستارے ٹانک رہا ہوں غزل کے آنچل میں

بال و پر رکھ کے بھی اس گلشنِ ہستی میں صبا
میں نے محسوس کیا ہے پر و بال کی طرح

داہنی آنکھ پھڑکتی ہے پھڑکنے دو صبا
یہ علامت ہے نئے وقت میں اچھائی کی

مجموعی طور پر یہی کہا جاسکتا ہے کہ صبا نقوی نے 'جمال فن' کی شکل میں جو شعری سرمایہ قاری کے حوالے کیا ہے اس میں ان کی شعری کائنات کا کچھ اثاثہ شامل ہے۔اس کلشن میں انھوں نے زندگی کے ہر پہلو کے گل بوٹے سجانے کی کوشش کی ہے اور اپنی شعری ہنرمندی کا لوہا بھی منوایا ہے۔صبا نقوی نے جو شعری اسکول قائم کیا ہے اس میں کئی اہم شاگردوں اور ہم عصروں کا عکس ہے۔'جمال فن' ان کے لیے مشعل راہ ہے اور عزم کی راہ پر گامزن رہنے کی ترغیب بھی۔ صبا نقوی کا تخلیقی سفر ابھی جاری ہے اور ان کے مداحوں اور قدردانوں کے لیے ان کی ریاضت فن باعث فخر ہے، مثلاً:

کسی مزدور سے اس خون کی قیمت پوچھو
جو ٹپکتا ہے صبا رخ سے پسینے کی طرح

زندگی کی رتق سے بیگانہ
عہد حاضر کا آدمی ہوں میں

■◆■

بقیہ: مدھیہ پردیش میں اردو صحافت

صفحہ ۲ سے آگے

تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ یہ رسالہ کئی سال تک شائع ہوتا رہا۔ سائیکلو اسٹائل فارم پر شائع ہونے والا ایک اور رسالہ ماہنامہ 'گلشن کے پھول' زیر ادارت گلشن راہی ۱۹۸۱ء میں سیہور سے جاری ہوا تھا، اس کے متعلق بھی یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ رسالہ کتنے عرصے تک جاری رہ سکا۔علمی و ادبی سرگرمیوں کے اعتبار سے سرونج کو ایک خاص مقام حاصل ہے، پریس کی آسانی نہ ہونے کے سبب یہاں سے گرچہ کوئی اخبار جاری نہ ہوسکا، البتہ کئی معیاری قلمی رسالے ضرور نکالے گئے۔ ۱۹۳۷ء میں انتصار احمد ہاشمی نے، ۱۹۵۶ء میں ت۔م۔ جواد اور مجروح عرفانی نے 'تعمیر نو'، ۱۹۶۷ء میں خالد محمود اور مختار شمیم نے 'راہی'، ۱۹۷۷ء میں شان فخری نے ماہنامہ 'حصار' نکالا۔ یہ تمام قلمی رسالے تھے۔ پریس میں طبع ہوکر شائع ہونے والا 'احتساب' سبق سرونجی نے ۱۹۸۳ء میں سرونج سے جاری کیا''۔

اس طرح یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ملک کی آزادی کے بعد جو اردو زبان اور صحافت متاثر ہوئی تھی، وہ رفتہ رفتہ آج پھر اس مقام تک پہنچ گئی ہے اور ایک بار پھر اردو صحافت عروج کی جانب گامزن ہے۔ اردو صحافت اور صحافی جو مایوس ہوچکے تھے انھیں مایوسی کے غار سے نکالنے میں ای ٹی وی اردو، 'راشٹریہ سہارا' اور 'چوتھی دنیا' جیسے خوب صورت معیاری اخبارات نے بڑا رول ادا کیا ہے، حالاں کہ اردو صحافت میں ابھی بہت سی خامیاں ہیں جنھیں دور کرنا ضروری ہے۔ خاص طور سے مدھیہ پردیش میں ایسا کوئی بڑا اخبار نہیں ہے جس پر کہ اردو صحافت پر فخر کر سکے۔حالات بہر حال خراب ہیں لیکن مایوس کن نہیں ہیں۔ امید ہے کہ دیگر صوبوں کی طرح مدھیہ پردیش میں بھی کوئی ایسا جیالا اٹھے گا جو اردو صحافت کو زندہ و تابندہ بنادے گا۔ ●●

بقیہ: ٹیگور، پریم چند اور...

صفحہ ۸ سے آگے

قریب سے دیکھا تھا۔انھوں نے دیہی ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں اور کسان، زمیندار، کلرک اور پٹواری کی زندگی کو ذات پات اور اونچ نیچ کی لعنتوں کو اور استحصال اور خود غرضی کی بدعتوں کو گہرائی میں جاکر دیکھا تھا، اسی لیے ان کے کرداروں میں خواہ وہ ہوری (گئودان) یا دیوی دین (غبن)، محمد سلیم (میدان عمل) ہو یا منوہر (بازار حسن)۔ پریم چند کی اپنی زندگی کی جھلکیاں اور اپنے نظریات وافکار کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔

پریم چند کے ناولوں میں زندگی کی سیدھی سادی اور جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں اسی لیے اگر گہرائی سے نہ دیکھیں تو ان کے ناولوں میں سپاٹ پن کا بھی احساس ہوتا ہے حالاں کہ اپنے موضوع اور اپنے اسلوب میں پریم چند نے جو سادگی برتی ہے وہ اردو ناول میں سادگی کی ایک نئی جمالیات ہے اور جسے مغربی ناول کے تنقیدی اصولوں کی عینک سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ اس لیے یہ بات صحیح ہے کہ جو لوگ ناول سے محض جذباتی اور جبلی تسکین چاہتے ہیں انھیں پریم چند سے زیادہ شرت چندر اور ٹیگور کے ناول پرکشش اور کامیاب نظر آئیں گے کیوں کہ پریم چند کے ناولوں کے برعکس شرت چندر اور ٹیگور کے ناول سماجی و معاشی مسائل کے حقائق سے زیادہ رومانی اور تخیلی رنگ رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی ان میں عشق و عاشقی اور خصوصاً جنسیت کی چاشنی بھی ملتی ہے چناں چہ پریم چند اور ٹیگور کے ناولوں کے مزاج میں ایک نمایاں فرق اسی مرحلے پر سامنے آتا ہے۔لیکن یہ فرق ٹیگور کے ادب اور پریم چند کے ادب کے درمیان کا فرق نہیں بلکہ اس عہد کے بنگلہ ادب اور اردو ادب کے درمیان کا فرق ہے۔ دراصل پریم چند نے جب لکھنا شروع کیا اس وقت بنگلہ ادب رومانیت، تصوریت اور جنسیت کے آغاز وارتقا کے کئی منازل طے کرچکا تھا جو ہمیں اردو ادب میں رومانوی تحریک کے افسانہ نگاروں خصوصاً سجاد حیدر یلدرم، امتیاز علی تاج اور نیاز فتح پوری وغیرہ کے یہاں نظر آتا ہے۔ خود پریم چند کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ ٹیگور اور شرت چندر کے یہاں تخیلیت اور جنسیت کی جو رنگارنگی ملتی ہے، اس سے ان کے ناولوں میں دل چسپی کا عنصر پیدا ہوتا ہے۔ چناں چہ ایک بار سینیئر رنگار سے باتیں کرتے ہوئے پریم چند نے اس کا اعتراف بھی کیا تھا:

''بنگالی ادب دل کو زیادہ چھوتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اس میں جنسیت زیادہ ہے... وہ لوگ تخیل پرست ہیں۔تخیل کی پرواز میں جہاں جہاں پہنچ سکتے ہیں وہاں میری پہنچ نہیں...گیان سے جہاں نہیں پہنچا جاتا وہاں بھی تخیل سے پہنچا جاتا ہے۔لیکن میں سوچتا ہوں ریاضت بھی چاہیے رابندر اور شرت دونوں عظیم ہیں...'' (قلم کا سپاہی،ص ۱۳۶)

اسی لیے گرچہ ان تینوں کے یہاں اصلاح اور تعمیر کے جذبے یکساں طور پر ملتے ہیں لیکن اس باب میں جہاں ٹیگور اور شرت چندر تخیلیت، تصوریت اور مثالیت سے کام لیتے ہیں وہیں پریم چند حقیقت پسندی سے، ٹیگور کے یہاں سرسری جہان سے گزرنے کا عمل ملتا ہے اسی لیے ان کے یہاں جستہ جستہ زندگی کی سچائیوں کے محض ہلکے اشارے اور زندگی کے مسائل کی دھیمی دھیمی آنچ ملتی ہے جب کہ پریم چند کے یہاں ایک قطعیت پائی جاتی ہے۔ ایسی قطعیت جو زندگی کو بہت قریب اور اتھاہ گہرائی سے دیکھ اور جھیل کر ہی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے ان کے پاؤں سچائیوں کی زمین پر مضبوطی سے جمے ہوئے بھی نظر آتے ہیں، مثال کے طور پر پہلے ٹیگور کو لیں، 'نوکا ڈوبی' اور 'جیون پربھات' ٹیگور کے دو اہم اور کامیاب ناول ہیں لیکن تجزیہ کیا جائے تو یہ دونوں ناول فنی اعتبار سے پریم چند کے دوسرے درجے کے ناولوں سے بھی کمتر نظر آئیں گے بلکہ شرت چندر کے ناولوں کے مقابلے میں بھی ان کی زیادہ اہمیت نہیں، دونوں ناولوں کے موضوعات بڑے ہی اچھے، زرخیز اور اچھوتے ہیں۔ ان موضوعات کے تحت کوئی بھی بڑا فنکار مثلاً پریم چند مقصد براری کے لیے ہی سہی بہت کچھ کہہ سکتا تھا اور اپنے موضوع کی بنیاد پر اپنی فن کاری کا بھرپور مظاہرہ کرسکتا تھا، لیکن رابندر ناتھ ٹیگور سے ایسا نہ ہوسکا کیوں کہ ٹیگور، پریم چند کی طرح صرف اور محض فکشن نگار نہ تھے۔

(باقی آئندہ)

دوسری قسط

ٹیگور، پریم چند اور ناول کی شعریات

رومانیت، جذباتیت اور عقلیت یا نظریے کی ہلکی ہلکی لہریں پریم چند کے یہاں بھی نظر آتی ہیں، مثلاً 'گوشۂ عافیت' 'بازارِ حسن' وغیرہ میں جس طرح وہ اپنے کرداروں کے ذہن و دل میں اتر کر ان کی کیفیات بیان کرتے ہیں اور ویشیاؤں، بیواؤں، اچھوتوں سے جس طرح ہمدردی کرتے ہیں، عورتوں کو جس انداز میں مردوں کے شانہ بہ شانہ چلنے کی ترغیب دیتے ہیں ان سب میں پریم چند کی جذباتیت اور رومانیت بھی کارفرما ہے، اسی طرح سوامی دیانند اور مہاتما گاندھی کے اثرات جہاں جہاں ان کے ناولوں میں در آئے ہیں وہاں وہاں وہ عقلیت پسند بھی نظر آتے ہیں، لیکن یہ وقتی جذبے تھے، 'نرملا'، 'میدانِ عمل'، 'گئودان' تک آکر وہ ان وقتی تاثرات سے بھی آزاد ہوجاتے ہیں حتیٰ کہ مہاتما گاندھی کے نظریات اور حصولِ آزادی سے متعلق ان کے طریقۂ کار کی بھی مخالفت کرتے ہیں، لیکن اس نکتے کو سمجھنے کے لیے پریم چند کے تخلیقی پس منظر کو جاننا ضروری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندستان میں جب نشاۃِ ثانیہ کا فروغ ہوا اور قومی بیداری کی لہر آئی تو غلام ملک کے عوام (خصوصاً نچلا اور متوسط طبقہ) غلامی کی چکی میں پسنے مفلسی و بدحالی سے کراہ رہے تھے ان حالات میں پریم چند نے اصلاح پسندی اور حب الوطنی کے رجحان کے زیر اثر ناول لکھنا شروع کیا۔ اصلاح کے لیے پریم چند حقیقت کے متلاشی تھے، شرت چندر اور ٹیگور کی طرح ان کی دل چسپی کا مرکز فرد نہیں 'سماج' تھا اور حقیقت کی تلاش کے اسی عمل میں اول تو انھوں نے سوامی دیانند کا سہارا لیا پھر مہاتما گاندھی کا، چناں چہ یہی وجہ ہے کہ پریم چند نے فرد پر سماج اور ملک و قوم کو فوقیت دی۔ 'میدانِ عمل' اور 'چوگانِ ہستی' اس کی مثالیں ہیں، ایسے 'میدانِ عمل' پر چوں کہ گاندھی-اروِن سمجھوتے کا اثر تھا اور اس ناول میں پریم چند بڑی حد تک سمجھوتہ وادی بھی نظر آتے ہیں لیکن پھر بھی پریم چند بھی پنڈت نہرو کی طرح گاندھی اروِن مصالحت سے مطمئن نہیں تھے۔ پنڈت نہرو نے اس کا اظہار اپنی سوانح عمری (Discovery of India, P.259) میں، پریم چند نے اپنے کامیاب ترین ناول 'گئودان' میں کیا ہے۔ 'گئودان' میں شرت چندر اور ٹیگور کے ناولوں کی طرح نہ تو رومانیت ہے نہ عینیت پسندی اور نہ ہی من گھڑت سوچے ہوئے واقعات اور ماحول بلکہ زندگی کی مختلف داخلی تہوں کو ادھیڑنے اور زندگی کی بنیادی سچائیوں کو منکشف کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ یہ بات پریم چند کے دیگر شاہکار ناولوں میں بھی کسی نہ کسی حد تک ضرور ہے اسی لیے پریم چند کے ادب کی سماجیات شرت چندر اور ٹیگور کے ادب کی سماجیات سے کہیں زیادہ گہری، عمیق تیز اور تعمیری ہے، حالاں کہ زمانی اور سماجی اعتبار سے پریم چند، شرت چندر اور ٹیگور تینوں کو کم و بیش ایک جیسے حالات درپیش تھے۔

پریم چند (۱۸۸۰-۱۹۳۶ء)، شرت چندر (۱۸۷۶-۱۹۳۸ء) اور ٹیگور (۱۸۶۱-۱۹۴۱ء) نے کم و بیش ایک ہی زمانہ پایا تھا جب ہندستانی عوام میں سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اقتصادی بیداری لانے کی مختلف سطحوں پر کوششیں جاری تھیں، لیکن دوسری جانب حکومت برطانیہ کی منافقانہ پالیسیاں اور تفریق و مخاصمت کی سازشیں، ہندستانی عوام کو ایک قوم کی بجائے امیر اور غریب، ہندو اور مسلمان، سکھ پارسی کے نام پر تقسیم کررہی تھیں۔ جاگیردارانہ نظام اپنے خاتمے سے پہلے اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ آخری دھار پا رہا تھا، امیر اور غریب، اعلا اور ادنا کے درمیان کی کھائی بڑھتی جارہی تھی اور اس ماحول میں زندگی کے تلخ حقائق کو محسوس نہ کرپانے والے شعوری طور پر یا تو عیش کوشی میں مصروف تھے یا پھر عسرت و افلاس کے بحر بے کنار میں موجوں کے تھپیڑے کھا رہے تھے، لیکن ادیبوں اور دانش وروں کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو ان تمام حقائق کو شدت سے محسوس کررہا تھا، اپنے وجود میں سمیٹ رہا تھا اور سمیٹ کر یوں بکھیر رہا تھا کہ اصلاح و انقلاب کی نئی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ یوں بھی بیسویں صدی کے اوائل سے ہی عالمی پیمانے کی انقلابی تحریکات غلام قوموں کی جد و جہد آزادی اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف احتجاج و بغاوت کے اثرات ہندستانی عوام پر تیزی کے ساتھ مرتب ہونے لگے تھے چناں چہ پریم چند اور ٹیگور جیسے فن کاروں کے یہاں انقلاب پسندی، انسان دوستی اور آزادی کے جو جذبات نظر آتے ہیں اس کی ایک اہم وجہ ان کے یہی عصری حالات اور ان کا سماجی شعور ہے۔

دوسری بات یہ کہ پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں سیاسی و معاشی افراط و تفریط، بڑی قوتوں کے سامنے چھوٹی قوتوں کا احساسِ بے بسی اور اس کے نتیجے میں غلام قوموں میں قومیت اور حب الوطنی کے جذبے رفتہ رفتہ جڑ پکڑ رہے تھے، اس وقت تک مارکس، فرائڈ، ہیگل، کارلائل اور روسو کے نظریات اور روسی انقلاب کے نتائج، ہندستانی دانش وروں کے فکر و نظر کو متاثر کرنے لگے تھے۔ دوسری جانب چیخوف، ٹالسٹائی، گورکی اور اورونگ کی اجتہادی ادبی کاوشیں اور آندرے بریتوں اور آندرے سالموں وغیرہ کے سرئیلی (Surrealistic) تخلیقی اظہار کے اثر سے ادبی اظہار کی نئی سمتیں بھی متعین ہورہی تھیں۔ حقیقت نگاری کا رجحان نت نئی صورتیں اختیار کرکے مثالیت و تصوریت کا شیرازہ بکھیر رہا تھا چناں چہ ہندستانی معاشرہ اور خصوصاً ہندستانی ادب و دانش در عرفان و آگہی کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے جہاں پر ادب کا تخلیقی عمل نرم رو سبزہ زار پر سبک خرامی کی بجائے ننگے پاؤں جلتے صحرا کا سفر بن جاتا ہے۔ اس پس منظر میں اگر جائزہ لیا جائے تو پریم چند، شرت چندر اور ٹیگور تینوں کا فن اپنے عہد کے حالات، عالمی تغیرات و انقلاب اور ان کے متوازی چلنے والی عصری ریشہ دوانیوں کے تناظر میں ہندستانی معاشرے کی اصلاح، اعلا و ارفع اقدار کی بازآفرینی، ملک کی آزادی اور جدید ہندستان کی تعمیر کا فن ہے۔ چناں چہ پریم چند ہوں یا شرت چندر یا ٹیگور، ان تینوں کے یہاں اپنے اپنے ظرف اور مزاج کے مطابق نئی نسلوں کے لیے حریت، امید، عمل، انسان دوستی، حق پرستی اور رواداری کا پیغام ملتا ہے، ہاں پریم چند کے پیغام میں خلوص اور حقیقت پسندی زیادہ ہے۔ ٹیگور بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن انھوں نے ناول، افسانے اور ڈرامے بھی لکھے اور رقص و مصوری میں بھی اپنے جوہر دکھائے۔ شرت چندر کی شہرت صرف ان کے ناولوں کی وجہ سے ہے، گرچہ انھوں نے افسانے بھی لکھے اور شاعری بھی کی۔ اسی طرح پریم چند بنیادی طور پر فکشن نگار تھے حالاں کہ انھوں نے ڈرامے بھی لکھے، صحافت بھی کی، تنقیدی مضامین بھی لکھے اور ترجمے بھی کیے۔ اس اعتبار سے پریم چند، شرت چندر اور ٹیگور کے یہاں جو بات قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ تینوں ہی ناول نگار تھے، بڑے ناول نگار۔ اس لیے ان تینوں کا بہ حیثیت ناول نگار تقابلی مطالعہ بہتر ہے۔ پریم چند کے ناولوں، مثلاً گئودان، میدانِ عمل، بازارِ حسن، گوشۂ عافیت اور نرملا وغیرہ اور ٹیگور کے ناولوں نوکا ڈوبی، گورا، جیون پربھات اور شرت کے ناولوں چرترہین، سریکانت، چندرناتھ، بڑی دیدی، شیش پرشن وغیرہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں کے یہاں اپنے سماج کے مسائل، دیہی اور قصباتی زندگی کے پیچ و خم، شہری زندگی کے نشیب و فراز، انسان کی آرزوؤں، نفسیاتی الجھنوں اور معاشی تنگ دامانیوں کا اظہار ملتا ہے لیکن اس باب میں ان تینوں کے یہاں ایک نمایاں فرق ہے، اسلوب اور رویے کا فرق۔ پریم چند کے ناولوں میں بلاواسطہ زندگی کی ٹھوس اور جھیلی ہوئی حقیقتوں کا اظہار ملتا ہے۔ نچلے اور درمیانی طبقے کے جو سماجی اور معاشی مسائل ان کے ناولوں میں پیش کیے گئے ہیں وہ پریم چند کے تخیل و تصور کا نتیجہ نہیں بلکہ مشاہدہ و تجربہ کا نچوڑ ہیں کیوں کہ انھوں نے اپنے عہد کے نچلے اور متوسط طبقے کے لوگوں کی زندگی کو خود ان کے درمیان رہ کر بہت

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

قدوس جاوید

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں   مطبوعہ: شمع آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237210, 23236299, Fax: 011-23236299
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org